مغربی مادہ پرستی کی فلسفیانہ بنیادیں اور اس کے نتائج

مریم جمیلہ صاحبہ کی کتاب Islam and Modernism کے ابتدائی دو ابواب سے ماخوذ

مترجم: محمد زاہد صدیق مغل

الحمد لله وكفى والصلاة والسلام على من لا نبى بعده الى كذاب والسلام على اله واصحابه اجمعين ومن اتبعه الى يوم الدين. اما بعد: فقد قا ل الله تعالى فى كلامه المجيد: ان يتبعون الا الظن. وان الظن لا يغنى من الحق شيئا. صدق الله العظيم

ضروری وضاحت: مضمون کی تمام شہ سرخیاں مترجم نے لگائی ہیں۔ صاحب تصنیف نے اصل مضمون میں کئی ایک جگہ طویل اقتباسات نقل کئے ہیں جن میں سے اکثر کو بطور خوف طوالت ترجمے میں شامل نہیں کیا گیا۔ قوسین میں '﴾' کے نشان والی وضاحت مترجم کا اضافہ ہے۔

صاحب تصنیف [مریم جمیلہ صاحبہ] کا مختصر تعارف: ---

باب اول:

قدیم یونان: دنیا کی پہلی سیکولر ریاست

جسم اور حسن کی پرستش: ایمانیات

یونان انسانی تاریخ کا وہ پہلا معاشرہ تھا جس نے اپنی ادارتی صف بندی، رسوم و رواج، آرٹ اور علمیت کی تشکیل کے ضمن میں مذہبی اقدار سے بغاوت کی روش اختیار کی۔ دوسرے لفظوں میں یونان صحیح معنوں میں پہلی سیکولر ریاست تھی۔ یونانی فکر اس مفروضے پر منتج تھی کہ وحی سے علی الرغم عقل انسانی کے ذریعے ایک مہذب، عادلانہ اور مربوط معاشرے کا قیام عین ممکن ہے اور یہی بنیادی سیکولر نظریہ آج تک مغربی تہذیب کا روح رواں رہا ہے۔

قدیم یونانیوں کے مطابق خوبصورتی کا بلند ترین اظہار برہنہ انسانی جسم میں ہوتا ہے [﴾ خوبصورتی کا حصول اور اسکا اظہار یونانی فکر کی بنیادی اقدار میں سے ایک اہم تر قدر تھی]۔ چنانچہ برہنہ انسانی جسم یونانی آرٹ کا

ایک بنیادی موضوع تھا جسے مجسمہ سازوں اور مصوروں نے بار بار زندہ کیا ہے۔ یونان میں جسمانی نشونما پر خصوصی توجہ دی جاتی جسکے لئے کھیل کود کا فروغ لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ ایسا کوئی شہر اور قصبہ نہ تھا جہاں کھلاڑیوں کی ریاضت اور تربیت کی خاطر سرکاری ورزش گاہ (gymnasium) نہ ہوتے ہوں۔ کھیلوں کے فروغ کیلئے بڑے بڑے میدانوں میں باقاعدہ اور باضابطہ مقابلے منعقد کروائے جاتے جہاں ہزاروں تماش بین اپنے من پسند کھلاڑیوں کے کھیل سے محظوظ ہوتے۔ کھلاڑیوں کا برہنہ حالت میں کھیل کود کرنا بھی ایک عام رواج تھا۔ ایسے تمام کھیل تماشوں کے مقابلوں میں اہم ترین المپک گیمز تھے جو آج بھی کھیلے جاتے ہیں [گو کہ اب اسکا مقصد سرمائے کی بڑھوتری ہے نہ کہ جسمانی خوبصورتی]۔

روم: حسن کی جگہ طاقت کی پرستش:

جنونیت اور تشکیکیت تک کا سفر:

بت پرست رومیوں نے سیکولر یونانی فکر کا ترکہ نہ صرف اپنی زندگیوں میں برتا بلکہ اسے مزید بڑھاوا بھی دیا۔ مگر چونکہ رومی بنیادی طور پر عسکریت پسند تھے، لہذا خوبصورتی کی پرستش کی جگہ طاقت کی پرستش نے لے لی۔ یونانیوں کی متشدد تصوریت (idealism) رفتہ رفتہ بگڑتے بگڑتے نہ ختم ہونے والی جنونیت (cynicism) اور تشکیکیت (skepticism) میں تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ ایک مشہور رومی فلسفی کچھ اسطرح دہریت کے حق میں دلیل قائم کرتا ہے:

''ابدی [خدا] کا ارادہ بھی ابدی ہوگا۔ اگر ہماری دعا اسکے ازلی ارادے کے مطابق ہوئی، تو اسے ایسا کام کرنے کے لئے کہنا جسکا فیصلہ اسنے پہلے ہی کر رکھا ہے فضول ہے۔ اور اگر کوئی اس سے خلاف ارادہ کام کرنے کی دعا کرے، تو ایسی دعا کرنا تو گویا اسے کمزور بے وقعت اور متضاد گردانے کے مترادف ہوگی، گویا یہ تو اس [خدا] کا مذاق اڑانے والی بات ہوئی۔ یا تو تم اس سے ایک اچھی شے کا مطالبہ کروگے جو اسے لامحالہ کرنا ہوگی اور یہ تمہاری دعا کے بغیر بھی ہو جائے گی، اور یا پھر ایسی شے مانگو گے جو بری ہے جو کہ اسکی توہین ہے۔ یا تو تم اسکے فضل کے حقدار ہوگے یا نہیں ہوگے، اگر تم حقدار ہوئے تو وہ تم سے بہتر اسے جانتا ہے، اور اگر نہیں ہوئے تو تم اس سے ایسی شے کا مطالبہ کرنے کا گناہ کر رہے ہو جسکے تم حقدار ہی نہیں۔ المختصر ہم خدا سے صرف اس لئے دعا مانگتے ہیں کیونکہ ہم نے از خود اسے اپنے تصورات سے گھڑ رکھا ہے''۔

قرون وسطیٰ: یورپ میں مذہب کا عروج

قرون وسطیٰ کو مغرب میں گالی بنا دیا گیا:

سلطنت رومہ کے زوال سے نشاۃ ثانیہ تک ایک ہزار سالہ وقفے کے دوران یورپ میں کیتھولک چرچ کا زور رہا جسے قرون وسطیٰ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دور میں یورپی فکر کا سلسلہ یونانی فکر سے کٹ گیا۔ قرون وسطیٰ

بحیثیت خود ایک جدا گانہ اور مختلف تہذیب تھی جس میں قدیم یونانی اور رومی فکر کا کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا۔ درحقیقت قرون وسطی کی تہذیب صرف ان معنوں میں مغربی تھی کہ ایسا کہنا ایک جغرافیائی مجبوری ہے کیونکہ اس دور کی تہذیب ہر لحاظ سے موجودہ مغربی تہذیب سے مختلف اور متصادم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین یورپی تاریخ کے کسی دور کو قرون وسطی سے زیادہ بھیانک انداز سے پیش نہیں کرتے۔ چنانچہ انگریزی زبان میں شاید ہی کوئی ایسا لفظ ہو جسکے معنی میں ''medieval'' لفظ سے زیادہ منفی مفہوم شامل ہو۔ جب کبھی کسی امریکی یا یورپی کو اس لفظ سے واسطہ پڑتا ہے تو اسکے ذہن میں ظلماتی دور، وحشت و بربریت، جاگیرداری اور جہالت کا نقشہ گھوم جاتا ہے۔ جب کبھی کوئی مغربی شخص دنیا کے کسی عمل کو فرسودہ کہنا چاہتا ہے تو اس پر قرون وسطی کا لیبل چسپاں کر دیتا ہے۔

نشاۃ ثانیہ اور پروٹسٹنٹ: بگاڑ کا آغاز

بلند ترین خیر ''حصول قوت'' ہوگیا:

نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ہی بڑے علمی پیمانے پر ردعیسائیت تحریک (modernism) کا آغاز بھی ہوا جس نے یونانی اور رومی فکر کو فخریہ انداز سے پیش کیا۔ نشاۃ ثانیہ درحقیقت بت پرستی کا احیاء تھا جس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب نے دوبارہ اپنی اصل کی طرف ایسا پلٹا کھایا جواب تک ٹوٹنے میں نہیں آیا۔ نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم سرغنہ اٹلی سرکار کا حصہ Nicolo Machiavell (1469-1532) تھا۔ اٹلی سرکار کی تیرہ سالہ نوکری کے دوران وہ سپین اور فرانس کی عسکری قوت کے مقابلے میں اٹلی کی کمزوری سے بہت خائف و نالاں تھا۔ فرانس سے جنگ کے بعد اسے جلاوطن کر دیا گیا جہاں اسنے حصول قوت اور اسکے استحکام و پھیلاؤ پر بہت کچھ لکھا۔ وہ ایک انتہائی متشدد قوم پرست تھا جسکا خواب ایک متحد اور غالب و فرماں رواں اٹلی کا قیام تھا۔ انہیں معنوں میں اسے استبدادی ریاست کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اسکے خیال میں بلند ترین خیر 'حصول قوت' تھا۔

پروٹسٹنٹ ازم نے قومی چرچ قائم کیے:

قوم پرستی اور سیکولرازم کو مذہبی جواز دیا:

پروٹسٹنٹ تحریک اصلاح (Reformation) نے عیسائی دنیا کو اتنا کاری زخم لگایا جو آج تک مندمل نہ ہو سکا۔ مارٹن لوتھر نے صرف چرچ کی برائیاں گنوانے یا انکی تصحیح کی نشاندہی کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسکی مکمل مخالفت کی اور یہاں تک کہ اپنا ایک نیا مذہب بنا ڈالا۔ چنانچہ پروٹسٹنٹس کے ہاتھوں پوپ کی بالادستی کے انکار [﴾ اور مذہبی آزادی کی روش] نے سیکولر قوم پرستی کو مزید استحکام بخشا۔ اب ایک مضبوط اور متحد عیسائی سلطنت کے بجائے چھوٹے اور کمزور فرقے نما گروہ سامنے آ گئے جس میں سے ہر ایک کے اپنے جدا گانہ نظریات و مفادات تھے۔ پروٹسٹنٹ ملکوں میں ریاستی سرپرستی کے ماتحت باقاعدہ قومی چرچ قائم کئے گئے جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں مذہبی قوت محض سیکولر ریاستوں کی باج گزار بن کر رہ گئی۔

سائنسی علمیت کی ابتداء اور مذہب کا زوال:

تجربے و مشاہدے کے خلاف علم، علم نہیں:

تحریک اصلاح مذہب کے ساتھ ہی نشاۃ ثانیہ کے مفکرین نے عیسائی علمیت کے خلاف ایک زبردست ہتھیار حاصل کرلیا جسے سائنس کہتے ہیں۔ فرانسس بیکن (1561-1625) نے اپنی کتاب The New Atlantis میں جدید سائنس کی بڑائی بیان کرنے کیلئے ایک ایسے فرضی جزیرے کی تصویر کشی کی ہے جہاں سائنسی تحقیقات کرنے والا ایک بہت بڑا ادارہ قائم کردیا گیا ہے۔ جہاں کا حاکم آنے جانے والے لوگوں کو اس جگہ کی سیر کراتا ہے اور ان سے کہتا ہے ''ہمارے اس ادارے کا مقصد علل و معلول (cause and effect) و حرکت کائنات کے قوانین اور ارادہ انسانی کی حدود میں توسیع لانے والے طریقے کا علم حاصل کرنا ہے تاکہ ہر کام کرنا ممکن ہو سکے''۔[﴾ بیکن نے علم حاصل کرنے کیلئے تجربے پر بھرپور زور دیا اور اسکے علاوہ تمام ذرائع کو ناقابل اعتبار قرار دیا]۔ ڈیکارٹ (1556-1650) نے نئے حقائق دریافت کرنے کیلئے تجرباتی طریقہ علم کو مزید نکھارا اور ارسطو وغیرہ کے طریقہ کار کو چیلنج کیا۔ مغربی مفکرین بشمول ڈیکارٹ کے نزدیک فطرت محض ایک مشین کی مانند ہے جس میں کوئی روحانی معنی نہیں ہیں۔ تمام زندہ اشیاء کی حقیقت چند خود کار کیمیائی عمل و ردعمل میں پنہاں ہے۔ اسی وہم و خیال کی مستی میں ڈیکارٹ کہتا تھا: 'مجھے اجزاء ترکیبی دے دو میں تمہیں دنیا تخلیق کردوں گا'۔ نیوٹن (1643-1727) کے نظریات حرکت [Laws of Motion] جن کے مطابق کائنات چند ناقابل تبدیل فطری اصولوں کے ماتحت چل رہی ہے نے تنویری (Enlightenment) مفکرین کو مزید خمار عطا کیا اور اب وہ یہ دعوی کرنے لگے کہ ہر وہ شے جو انسانی تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہے قابل رد ہے۔ چنانچہ معجزات، نبوت، وحی، مذہبی رسومات و عبودیت سب کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ ولٹیئر (1694-1778) نے کہا کہ خدا نے اس دنیا کو بالکل اسی طرح بنایا ہے جیسے ایک گھڑی ساز گھڑی بناتا ہے یعنی جس طرح گھڑی بنانے کے بعد گھڑی ساز کی ضرورت نہیں رہتی اسی طرح اس کائنات میں اب خدا کے عمل دخل کی گنجائش موجود نہیں۔

خدا اور تصور خدا کے خلاف ہیوم کے دلائل:

ہیوم (1711-1776) نے تمام مذہبی ایمانیات کو اس بنیاد پر رد کردیا کہ انہیں نہ تو سائنسی تجربے اور نہ ہی انسانی عقل سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اسنے ولٹیئر کے گھڑی ساز خدا کے تصور پر بھی کاری ضرب لگائی۔ وہ کہتا تھا کہ [الف] ہم نے گھڑی کی تخلیق کا مشاہدہ تو کیا ہے لیکن تخلیق کائنات کا نہیں [﴾ یعنی تخلیق کائنات کو گھڑی کی تخلیق پر قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ اول الذکر تجربے سے ماوراء ہے]، [ب] اور اگر بالفرض ایسا کوئی گھڑی ساز خدا تھا بھی تو ہوسکتا ہے وہ اب تک مرچکا ہو، ہوسکتا ہے وہ خدا مرد یا عورت کی جنس سے ہو، ہوسکتا ہے بہت سارے خداؤں نے مل کر یہ دنیا بنائی ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسنے غلطی اور اصلاح کے اصول سے سیکھتے سیکھتے یہ دنیا بنائی ہو [﴾ یعنی گھڑی ساز خدا کے تصور سے خدا کا زندہ، علیم، قدیر، بے جنس، واحد وغیرہ ہونے جیسی صفات ہرگز ثابت نہیں ہوتیں]۔ اسی طرح

اس نے ایمان بالآخرت کے خلاف یہ بات کہی: 'ایک ایسی زندگی جہاں جزا وسزا کا قانون نظر نہ آ رہا ہو سے ایک ایسی دنیا کا منطقی وجود ہرگز ثابت نہیں ہوتا جہاں عدل ہو رہا ہے' [یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ آجکل کے مسلم متجددین اثبات ایمانیات کے ضمن میں اسی طرز کے عقلی دلائل دے رہے جنہیں آج سے دوسو سال پہلے ہی رد کیا جا چکا تھا]۔

اخلاقیات کو ریاضیات کی طرح کا علم سمجھا گیا:

حیاء اور عصمت کے تصورات ختم ہو گئے:

غلبہ سائنس کے بعد اخلاقیات کو بھی ریاضیات کی طرح ایک سائنس سمجھا جانے لگا جس کے لئے کسی مذہبی علیت کی ضرورت نہیں۔ ڈیڈروائٹ، روسو اور بینتھم جیسے فلسفی اس بات کے پوری طرح قائل تھے کہ اخلاقی اصول طے کرنے کا واحد معیار لذت پرستی (utility) ہے [یعنی درست طرز عمل یہی ہے کہ انسان اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کرنے کی کوشش کرے] مگر وہ یہ خیال ضرور رکھے کے دوسروں کا بعینہ ویسا حق نہ مارے۔ کسی عمل اور تعلق کے جائز یا ناجائز ہونے کیلئے اس بات کا لحاظ نہ رکھا جاتا کہ خدا کی مرضی کیا ہے، بلکہ یہ دیکھا جاتا کہ اسکے نتیجے میں کتنا مزہ اور کتنی تکلیف حاصل ہوتی ہے۔ نتیجتاً تنویری مفکرین کو حیاء اور عصمت کے تمام تر روایتی تصورات بھونڈے نظر آنے لگے۔

سائنسی غلبے کے نتیجے میں خدا کے سہارے کی ضرورت نہیں:

اپنے تئیں ان تمام تصورات کو شکست دینے کے بعد جنہیں وہ جہالت کا پلندہ سمجھتے تھے تنویری مفکرین نے یہ دعوے کئے کہ عقل انسانی کے درست سائنسی استعمال اور بڑے پیمانے پر لوگوں کو تنویری تعلیم دینے کے نتیجے میں یہ دنیا جنت بنائی جا سکتی ہے۔ سائنس کی قوت انسان کے ہاتھ لگنے کے بعد اب یہ ممکن تھا کہ انسان اپنی تقدیر خود بنا سکے۔ آزادی، معاشرتی ومعاشی مساوات اور عالمی امن کا دور دورا ہوگا۔ ہمیشہ بڑھتا ہوا علم تمام بیماریوں اور تکالیف کو ختم کر کے ایک پر لطف طویل زندگی کو ممکن بنا دے گا اور سائنسی علم کے غلبے کے بعد دنیا میں انسانی زندگی کی بقا کیلئے کسی سپر نیچرل قوت [خالق ارض وسماء، فرشتے وغیرہ وغیرہ] کے سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا اخلاقیات پر اثر:

انسان بہتر نسل کا جانور قرار پایا:

ڈارون (1809-1892) نے نظریہ ارتقاء پیش کیا جس کے مطابق انسانی زندگی کم تر شکلوں سے گزرتے ہوئے ترقی کر کے موجودہ شکل میں موجود ہے۔ اس نظریے نے اخلاقیات کے نئے معیارات متعارف کروائے۔ اب فلسفی انسانی زندگی پر ایک مسلسل بہاؤ (progression) اور تبدیلی عمل (change) کے تصورات کے تحت غور کرنے لگے جس کے نتیجے میں انسانی زندگی اور معاشرے زیادہ پیچیدہ اور بہتر شکل اختیار کرتے گئے ہیں۔ حیاتیاتی اصول ارتقاء کو جب معاشروں پر لاگو کیا گیا تو 'جدید'، 'ترقی یافتہ' اور up-to-date کے تصورات اچھے سمجھے

جانے لگے۔ تاریخ دانوں نے بھی انسانی معاشروں کی تاریخ کو اصول ارتقاء کے شکنجے میں کسنے کی بھرپور کوشش کی اور وہ یہ کہنے لگے کہ انسانی زندگی اپنے ماحول سے جدوجہد کرنے کے نتیجے میں آگے بڑھتی چلی آرہی ہے [﴿ درحقیقت یہ تمام قصے وکہانیاں وحی کو بحیثیت علم کالعدم قرار دینے اور انسانی معاشروں پر تعلیمات انبیاء کے اثرات کا انکار کرنے کے لئے گھڑی گئیں]۔ ڈارون نے مغربی مفکرین کو یہ باور کرادیا کہ انسان جانوروں کی مانند ذرا بہتر نسل کا جانور ہے۔ ولیم جیمز (1842-1910) نے تو کسی آزاد انسانی شعور کے وجود کا بھی انکار کیا، اسکے خیال میں انسانی خیالات بیرونی اثرات سے پیدا ہونے والے کیمیائی ارتعاشات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انہیں خیالات سے متاثر ہوکر پیولو (Pavlo) جیسے نفسیات دانوں نے انسانی اعمال کے محرکات کی تفہیم کے لئے کتوں، بندروں اور چوہوں وغیرہ کا مطالعہ کرنے کا طریقہ کار اپنایا [﴿ علم نفسیات میں آج بھی یہ ایک معتبر ترین طریقہ تصور کیا جاتا ہے]۔

فرائیڈ نے فلسفیوں کو مذہب کے خلاف تلوار مہیا کی:

مذہب انسان کی خود ساختہ تخلیق ہے:

فرائیڈ (1859-1939) کے انسانی اعمال کو حرکت دینے والے جبری تصور محرکات (compulsive drives) نے فلسفیوں کو مذہب کے خلاف ایک اور ہتھیار فراہم کردیا۔ فرائیڈ کے خیال میں ایک چھوٹا بچہ جسے اسکے والدین زندگی بخشتے ہیں، مشکلات سے بچاتے ہیں اور اسے جزا اور سزا کے ذریعے قاعدے کا پابند بناتے ہیں اپنے والدین سے حاصل کردہ انہی تصورات کو جوانی میں جاکر اپنی مذہبی زندگی کی شکل میں اپنا لیتا ہے۔ یہ تصور کہ مذہب خود انسان کا اپنا تخلیق کردہ ہے نیز اخلاقی قدریں اضافی شے ہیں تاریخ دانوں اور ماہرین سماجیات کو بہت بھلا معلوم ہوا۔ اسی تصور کے تحت تاریخ دان یہ سمجھتے ہیں کہ یہودیت اور اسلام کا تصور توحید عرب قبائلی کلچر کی پیداوار ہے۔ فرائیڈ نے صرف مذہب کی خدائی عطا کا ہی انکار نہیں کیا، بلکہ اسنے مذہبی ایمانیات کے جواز ہی کا سرے سے انکار کرڈالا۔

مارکس نے زندگی کا اصل مقصد مادی جدوجہد کو قرار دیا:

مادی فلسفہ اپنے عروج پر مارکس کے مادی جدلیت (dialectic-materialism) کے تصور پر پہنچتا ہے۔ مارکس کے خیال میں انسانی زندگی کے تمام گوشے معاشی تگ ودو اور عوامل کے نتیجے میں متعین ہوتے ہیں، یہاں تک کہ انسانی شعور کا احساس، عقائد اور اعمال سب کے سب معاشی جدوجہد کی پیداوار ہیں۔ اسکے خیال میں مادی ماحول میں بہتری کے نتیجے میں ایک مثالی معاشرہ قائم ہوجائے گا جو ایک جنت کا نمونہ ہوگا اور جہاں ہر شخص کو مساوی آزادی میسر ہوگی۔ شوپن ہار (Schopehauer) نے یہ کہہ کر کہ زندگی کی حقیقت محض ایک فضول اور بے معنی حرکت ہے مادی فلسفے کو اپنی منطقی منزل تک جا پہنچایا۔

تنویری ادب اور مذہب وموت کے تصورات:

تنویری شاعر اور ناول نگار دور حاضر میں پائی جانے والی غربت، افلاس، اموات اور تکالیف کو خدا کے

خلاف بطور حجت استعمال کرتے ہیں۔ وہ خدا کے رحیم ہونے کا انکار کرتے ہیں اور مذہبی لوگوں کو انسانی عقل کا مذاق اڑانے سے روکتے ہیں جو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس دنیا کی ہر تکلیف اور آنسو کا بدلہ دیا جائے گا۔ ان کے ایسے خیالات کی اصل وجہ انسانی زندگی کے لافانی ہونے کا انکار ہے، یعنی اگر ہم یہاں ناکام ہوئے تو ہمیشہ کیلئے ناکام ہوگئے۔ اگر ہم یہ زندگی ہار گئے گویا ہم سب کچھ ہار بیٹھے کیونکہ یہ زندگی ہی واحد اور آخری موقع ہے۔ زندگی کے اس قلیل تصور کے ساتھ جوں ہی موت کا سوال سامنے آتا ہے تو امیدیں، جوش اور امنگیں سب کے سب مدہم پڑنے لگتے ہیں۔

<u>باب دوئم:</u>

جدیدیت: مذہب کے خلاف مسلح بغاوت کا نام:

جدیدیت غالب اور آفاقی مذہب کئی رنگوں میں:

<u>جدیدیت مذہب اور اسکی تمام تر اخلاقی اقدار کے خلاف مسلح بغاوت کا نام ہے</u>۔ اس بغاوت کی جڑیں نشاۃ ثانیہ اور Machiavelli کے سیاسی نظریات سے جا ملتی ہیں۔ اسکا مکمل اظہار اٹھارویں صدی کے تنویری فرانسیسی فلسفیوں کے ہاں ملتا ہے، جبکہ انیسویں صدی میں ڈارون، مارکس اور فرائیڈ وغیرہ کے نظریات میں یہ اپنے عروج کو پہنچتی ہے۔ اپنی جائے پیدائش یورپ سے نکل کر اس فکر نے ایک وبا کی طرح ساری دنیا کو متاثر کیا ہے اور یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ آج جدیدیت ایک غالب اور آفاقی ایمان کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جو اس پر ایمان لے آئیں انہیں 'روشن خیال' اور 'ترقی یافتہ' کے القابات سے نواز جاتا ہے اور اسکے منکرین پر 'دقیانوسی' اور 'رجعت پسند' کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد اکثر ایشیائی اور افریقی مما لک کے حکمران اپنے پرانے آقاؤں سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ جدیدیت کے حامی بن جاتے ہیں۔ جدیدیت مختلف رنگوں شہ سرخیوں ناموں، چہروں اور لیبلوں کے ساتھ نمودار ہوتی ہے: کمیونزم، سوشلزم، کیپٹلزم، پریگمٹزم، پوزیٹوزم، فاشزم، نازی ازم، زاونزم، کمال ازم اور عرب نیشنلزم وغیرہ۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام نظریات اپنے باہمی اختلافات کے باوجود ایک ہی شجرِ خبیثہ کی شاخیں ہیں۔

انسان پرستی:

جدیدیت کا ایک بنیادی عقیدہ اخروی زندگی کا انکار ہے۔ انکار آخرت لامحالہ جسمانی آرام وسکون، مادی خوش حالی، دنیاوی کامیابیوں اور خواہشات کی تسکین کو ہی زندگی کا مطمع نظر سمجھ لینے کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ عقیدہ کہ انسان اپنے اعمال کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ نہیں ہے اخلاق حمیدہ پر کاری ضرب لگاتا ہے۔

جدیدیت کے تمام نظریات انسان پرستی کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں۔ انسانیت پرستی کا سب سے واضح اظہار سائنس کے لبادے میں ہوتا ہے۔ جدیدیت پسندوں کا پختہ یقین ہے کہ سائنسی ترقی کے نتیجے میں انسان تمام تر خدائی اختیارات کا مالک بن سکتا ہے۔ انسان پرستی کی ایک اور عام شکل نیشنلزم ہے۔ یہ درحقیقت اپنے خاص گروہ کے

مفادات کی اجتماعی پرستش اور دوسری قوموں کی نفرت سے عبارت ہے۔ اسکے اظہار کیلئے نازیوں کے یہودیوں پر، اسرائیل میں عربوں پر، انڈیا اور ترکی میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا نظارہ کر لینا کافی ہوگا۔ نیشنلزم ایک بھرپور طاقتور ریاست کی تابعداری کا تقاضا کرتی ہے۔ سیاسی رہنماؤں کی پوجا کی جاتی ہے، انکی تصاویر اور مجسموں کو عام چوراہوں پر لگایا جاتا ہے۔ نازی فوجی اپنے سینوں پر ہٹلر کی تصویر لٹکائے پھرا کرتے تھے، اور جب وہ زخمی ہو جاتے یا ہسپتال میں آخری سانسیں گن رہے ہوتے تو اسکی تصویر کو چومتے اور آنکھوں پر لگاتے دکھائی دیتے تھے۔ روس میں لینن کی لاش کو تقریباً پچھلی پانچ دہائیوں سے شیشے کے ایک بڑے صندوق میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ ریڈ اسکوئر پر قائم اسکا مقبرہ ایک ایسا قومی آستانہ ہے جہاں سخت سردیوں کے دنوں میں بھی لوگ اسکے ایک نظارے کی خاطر گھنٹوں قطار میں کھڑے رہتے ہیں۔ اسی طرح اسٹالین کی لاش کو بھی لینن کی بغل میں سجا کر رکھا گیا ہے۔

جدیدیت: حقیقت اور اخلاقی اقدار ابدی نہیں:

زمانہ حال میں رہنا اعلیٰ ترین خیر ہے:

تمام جدید نظریات مذہبی اقدار کو کلیتاً رد کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک حقیقت کو جاننے کا کوئی معروضی اور حتمی معیار موجود نہیں ہے۔ حقیقت اور اخلاقی اقدار محض اضافی (relative) چیزیں ہیں جنکی صداقت وقت، مقام اور حالات کی مرہون منت ہے۔ الہامی تعلیمات پر مبنی معاشروں کو جدیدیت پسند 'بے جان' اور 'مردہ' کے ناموں سے پکارتے ہیں اور 'تبدیلی' بذات خود ایک خیر تصور کی جاتی ہے اور تبدیلی جتنی تیزی سے ہو اتنا ہی اچھا سمجھا جاتا ہے۔ جدیدیت میں 'زمانہ حال میں' (up-to-date) ہونا خیر اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیا اور اچھوتا پن چاہے خواتین کے لباس کی صورت میں ہو، نئے ماڈل کی کار کی صورت میں یا پھر نئے ڈانس کے خبط کی صورت میں، تبدیلی ہر حال میں قابل قدر تصور کی جاتی ہے۔

خاندان کی تباہی صنعت کاری، شہروں کے پھیلاؤ آزادئ نسواں کے ذریعے

بڑے شہروں نے سادہ اور فطری زندگی کا خاتمہ کر دیا ہے:

جدیدیت کا ایک اور بڑا مقصد خاندان اور گھریلو زندگی تباہ و برباد کرنا ہے۔ چنانچہ کارل مارکس نے اپنے Communist Manifesto میں خاندان کا ادارہ مٹا دینے کے حق میں وکالت کی ہے اور یہ مقصد روس اور چین میں سب سے بہتر انداز میں پایہ تکمیل کو پہنچا ہے۔ غیر کمیونسٹ ملکوں میں بھی خاندان کی بربادی کا عمل جاری و ساری ہے گو کہ اسکی رفتار ذرا کم ہے۔ خاندان کی تباہی کے لئے کئی ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں: [۱] صنعت کاری (Industrialization)، [۲] شہری آبادیوں کا پھیلاؤ (urbanization)، [۳] عورتوں کی آزادی۔ در حقیقت یہ تینوں عمل بیک وقت اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ جدید صنعت کاری کے نتیجے میں زیادہ تنخواہوں اور مادی فوائد کے مواقع لوگوں کو ایک ساتھ مل جل کر اور باہم مربوط دیہاتی طرز زندگی چھوڑنے پر مجبور کر کے انہیں اجنبی شہری زندگی میں

کھینچ لاتے ہیں، جسکے نتیجے میں خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔صنعت کاری کے بعد خاندان ایک خود کفیل ادارہ نہیں رہ پاتا اور نتیجتاً باپ دن کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا ہے اور ماں کو بھی مشینوں کے ذریعے جلدی سے گھر کے کام کاج ختم کرنے کے بعد اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے اور اسے بھی باہر کی راہ سجھائی دیتی ہے۔اب نرسریاں، چائلڈ کیئر سینٹر اور اسکول بچوں کی تربیت کا ذمہ لے لیتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود بچوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے بند کمروں میں کھیل تماشوں کی مشینوں، ٹی وی اور گلیوں میں کسی نگرانی کے بغیر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ایسے حالات میں کمسن بچوں کے جرائم میں اضافہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔

آزادئ نسواں کے ذریعے خاندان کا مکمل خاتمہ:

اس میں کچھ شک نہیں کہ جدیدیت کے پھیلاؤ میں عورتوں کی آزادی سب سے کارآمد اور ضروری ہتھیار ہے۔گھرداری کے کام کو غیر تسلی بخش، غیر اہم اور لایعنی ثابت کرنے سے لے کر ہر ایسا ہتھکنڈا اختیار کیا جاتا ہے جو عورت کو گھر سے باہر نکالنے میں مددگار ہو۔اس کے لئے بڑے پیمانے پر میڈیا پر مہم چلائی جاتی ہے جس میں گھرداری کے کردار کو فرسودہ اور ان عورتوں کے کردار کو بڑھا چڑھا کر دکھایا جاتا ہے جو مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی دکھائی دیتی ہیں۔وہ بیوی جو اپنے شوہر سے معاشی آزادی حاصل کرتی ہے شوہر کے گھر کا سربراہ ہونے کا کردار تباہ کر ڈالتی ہے۔ ایسے گھر جہاں خواتین کی بالادستی ہو وہاں باپ بچوں کے لئے کم ہی قابل عزت ہستی ہوا کرتا ہے۔

آزادئ نسواں سے زناکاری اور حرامی بچوں کا تعلق:

خاندان کی تباہی میں سب سے بڑا کردار ناجائز تعلقات قائم کرنے کی آزادی ہے۔عورت کے جسم کی نمائش کرنے اور اسے سرمائے میں اضافے کے لئے استعمال کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا جاتا۔اسکے نتائج کنواری حاملہ، ناجائز بچوں، لاتعداد اسقاط حمل، طلاقوں کی شرح میں ہوش ربا اضافے، جنسی جرائم اور جنسی بیماریوں کی شکل میں دیکھے جاسکتے ہیں۔وہ ممالک جہاں جدیدیت کا دبدبہ ہے وہاں مرد کی دوسری شادی کو تو ناقابل معافی جرم تصور کیا جاتا ہے، مگر ناجائز تعلقات کو نجی مسئلہ کہہ کر قانون کی گرفت سے باہر سمجھا جاتا ہے۔

جدید معاشروں میں جوان نظر آنا سب سے اہم ہے:
بوڑھے کسی عزت اور اہمیت کے قابل نہیں ہوتے:

'بزرگوں' کے بارے میں حقارت انگیز رویہ بھی جدیدیت کی خاندان کی طرف منفیت کی عکاسی کرتا ہے۔جدیدی ممالک میں عموماً اور جبری قومی ریاستوں میں خصوصاً جوانی کی اہمیت کا اظہار مختلف جوانوں کے تہواروں، کھیلوں، فوجی پریڈوں وغیرہ کی شکل میں کیا جاتا ہے۔امریکہ اور مغربی یورپی ممالک میں 'حسن کے مقابلے' اور 'جنسی مقناطیسیت پر زور' درحقیقت جوانی کی پرستش ہی کا اظہار ہیں۔ایسے تمام ممالک جو جدیدیت کی زد میں ہیں وہاں بزرگوں کا معاشرتی مقام بہت کم ہے۔بچوں میں اپنے بڑوں کے بارے میں یہ شعور پیدا کر کے کہ انکے بزرگ

پرانے خیالات کے حامل ہیں پشتی خلا (generation gap) کو بڑھاوا دیا جاتا ہے۔

بزرگوں کا وجود جدید معاشرے میں ناقابل برداشت بوجھ ہے:

بزرگوں کی خدمت سے چھٹکارا حاصل کرنا نوجوان نسل کے نزدیک انکی خوشیوں کے لئے ضروری امر ہے۔اور جو بچے اپنے والدین کی خدمت کرتے بھی ہیں وہ انہیں ایک ناقابل برداشت بوجھ سمجھتے ہیں۔نتیجتاً بوڑھے اور بیمار ماں باپ اپنے آخری دن اولڈ ہاؤسز یا پاگل خانوں میں گزارتے ہیں جہاں انکی حیثیت ایک بے کار شہری اور معاشرتی بوجھ کی سی ہوتی ہے۔اس ضمن میں یہ سمجھنا حیران کن نہیں کہ ادھیڑ عمر کے لوگ آخر کیوں اپنی ڈھلتی عمر پر پشیماں نظر آتے ہیں اور کیوں وہ خود کو جوان ظاہر کرنے کی خاطر ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔چنانچہ امریکہ اور یورپ میں ہر سال خواتین اپنے بالوں کو ڈائی کرانے اور میک اپ کے سامان پر ہوش ربا دولت لٹا دیتی ہیں۔ پچاس برس کی خواتین اس تصور سے ہلکان رہتی ہے کہ اسکا جسم ایک جوان لڑکی کی مانند کیوں نظر نہیں آ رہا۔

زندگی کا نامکمل تصور

جدیدیت کی ایک بڑی کمزوری انسانی زندگی کے بارے ایک مکمل تصور قائم نہ کر پانا بھی ہے۔مثلاً فرائیڈ نے جنسی خیالات اور مارکس نے معاشی محرکات کو پوری زندگی پر حاوی کر دیا ہے۔زندگی کو اسطرح ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھنا ہر جدیدی نظریے کا خاصہ ہے جس میں انسانی زندگی کے کسی ایک شعبے کو اس کے اصل مقام سے اٹھا کر اسکی اہمیت مبالغہ انگیز حد تک بڑھا دی جاتی ہے۔یعنی جزو کو کل سمجھ لیا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کی بنیاد ہی شر پر رکھی گئی ہے

مغربی تہذیب کی برائیوں کی نوعیت واقعاتی یا حادثاتی نہیں اور نہ ہی یہ انسانی کمزوریوں کی بناء پر ہیں جو بلند اور نیک مقاصد حاصل کرنے میں مانع ہوں [﴾ یعنی ایسا نہیں ہے کہ مغربی تہذیب کی اصل کسی خیر پر مبنی ہے اور اسکے ظاہر میں کچھ برائیاں اسلیئے پائی جاتی ہیں کہ اس خیر کو برتنے میں کچھ انسانی کوتاہیاں ہوگئی ہیں جیسا کہ ہمارے بعض مسلم مفکرین کا خیال ہے]۔بلکہ مغربی تہذیب میں تو کسی 'بلند اور راست' مقصد کا وجود سرے سے موجود ہی نہیں ہے [﴾ اسی لئے مارما ڈیوک پکتھال صاحب نے کہا تھا کہ مغربی تہذیب درحقیقت تہذیب نہیں بلکہ 'بربریت' (savegery) یعنی تہذیب کی ضد ہے، اصلاً تو تہذیب صرف اسلام ہی ہے]۔مغربی تہذیب اپنے نظریے اور عمل دونوں میں سراسر شر ہے اور یہ شر اسکے فلسفے میں اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ اسے زائل کرنا ممکن نہیں۔ ہوسکتا ہے کوئی اصرار اور اعتراض کرے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر مغرب نے زندگی کے بعض شعبوں میں عروج کیسے حاصل کر لیا۔لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ باطل اور شر ہمیشہ حق اور خیر ہی کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں [﴾ یعنی مغربی تہذیب کے غلبے نے ہمارے تصور خیر و شر ہی کو بدل ڈالا ہے جسکی وجہ سے ہمیں اسمیں کچھ خیر نظر آتا ہے]۔اسی لئے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ شر ہمیں مکمل طور پر سیاہ دکھائی دے۔